© rasailojaraid.com

مہنگائی بھی سود ہے

ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی نے مفلوک الحال غریبوں کو غربت کی اس نہج تک پہنچا دیا ہے، جہاں از روئے شرع اشیائے حرام بھی، جائز ہونے لگتی ہیں۔ تمام انسانوں کو زندہ رہنے اور ضروری اشیا تک ان کی رسائی عام ہونے کو حق مساوات کے تحت بلا تفریق رنگ و نسل، ایک مسلمہ کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر اس حق قانونی و اخلاقی کے اجماعی جواز کے باوجود لوگوں کا علاج کے پیسے نہ ہونے کے سبب مرجانا، غربت کے باعث خودکشی جیسے اقدام سے گزر جانا، اپنے تن سے پیدا کی ہوئی اولاد کو بیچ ڈالنا یا خود اپنے ہاتھوں ختم کر دینا اس مسلمہ کی بے اعتباری کو ظاہر کرتا ہے۔

تسلیم شدہ حقائق، کسی ثبوت اور برہان کے محتاج نہیں ہوتے۔ ہمارے نزدیک مہنگائی اور غربت ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ اگر مہنگائی بڑھنے کا مطلب غربت کا بڑھنا ہے تو غربت کا خاتمہ بھی مہنگائی کے خاتمے کے بغیر ناممکن ہے۔ مگر مغربی اقتصادی دنیا میں مہنگائی کے متعدد اسباب بیان کیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ مہنگائی کو ترقی کی بنیاد بھی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے گزشتہ کئی دہائیوں سے مہنگائی ایک عالمی مسئلہ بن چکی ہے۔

مغرب اور ہمارے معاشروں میں مہنگائی کے اسباب اور اثرات الگ الگ ہیں۔ مغرب کی مہنگائی، مغربی لوگوں کے لیے موت کا پیغام نہیں بنی، لیکن ہمارے معاشروں میں قانون و اخلاق کی پامالی کے سبب، مہنگائی ایسی وبائی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ بستیوں کی بستیاں اور آبادیوں کی آبادیاں دیکھتے ہی دیکھتے، غیر محسوس انداز میں عالمی منڈیوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اور غریبوں کو پتہ بھی نہیں چل پاتا کہ کس طرح مغرب نے انہیں قربان کر دیا ہے۔ حقیقت میں مرتے ہوئے اور بظاہر زندہ بھوک و پیاس کے مارے انسانوں کی اپنی کوئی تہذیب نہیں ہوتی، ایسے مجبور و مضطر لوگ کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا علمی و عملی حل، معاشرے کے سربراہوں کو اپنے اہل فکر و نظر افراد کے ساتھ بیٹھ کر تلاش کرنا ہوگا۔

ہمارے نزدیک مہنگائی، ربا کا دوسرا نام ہے۔ وہ ربا جسے قومی بچت کی اسکیموں اور بینکوں میں منافع کی شکل میں تلاش کیا جاتا ہے، اور جس کی سنگینی کو نمایاں کرنے کے لئے اسے ماں سے نکاح کرنے سے بھی بدتر قرار دیا جاتا ہے۔ مگر افسوس کہ مہنگائی کا یہ مہیب اور جان لیوا عفریت (یعنی جبری منافع) ہمارے سخن فہموں کو نظر نہیں آتا۔ وہ مہنگائی کے ذمہ داروں کو، ربا پھیلانے، ربا کھانے اور کھلانے کا ذمہ دار نہیں سمجھتے، حالانکہ قرآن کی زبان میں وہ تمام لوگ جو بلا جواز غیر اخلاقی اور غیر قانونی طور پر احتکار، اکتناز، اور ارتکاز وغیرہ کی شکل میں، لوگوں سے جبری منافع کما رہے ہیں۔ وہ سب کے سب "تخبطہ الشیطان" (البقرہ، ۲۷۵) کے زمرے میں آتے ہیں۔ کیونکہ جبری منافع اور معاشی استحصال ہی اصل ربا ہے۔

(مدیراعلیٰ)

مسئلۂ نسخ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(آیت وصیت و وراثت کے مابین ایک تطبیقی جائزہ)

پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج
استاذ الفقہ والتفسیر،
شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۷۶۲ء) الفوز الکبیر فی اصول التفسیر میں نسخ کے بارے میں لکھتے ہیں کہ متقدمین یعنی صحابہ اور تابعین اسے لغوی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ جبکہ متاخرین اسے اصطلاحی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ ان کے اپنے خیال کے مطابق متقدمین کے نزدیک "معنی نسخ میں ایک آیت کے بعض اوصاف کا ازالہ دوسری آیت کے ساتھ ہوگا۔ یہ ازالہ اوصاف عام ہے کہ مدت عمل کی انتہا ہو یا کلام کو اس کے متبادر معنی سے غیر متبادر کی جانب پھیر دینا ہو یا یہ بیان کہ قید سابق اتفاقی تھی اور یا لفظ عام کی تخصیص ہو اور یا منصوص اور مقیس علیہ ظاہری میں امر فارق کا بیان یا جاہلیت کی کسی عادت اور یا شریعت سابقہ کا ازالہ ہو"(۱)

مطلب یہ کہ متقدمین کے ہاں نسخ سے مراد یہ ہے کہ ۱۔ کوئی مضمون پہلے "مطلق" بیان کیا گیا۔ جسے دوسری جگہ "مقید" کر دیا گیا۔ ۲۔ یا پہلے کوئی مضمون "مجمل" طور پر آگیا۔ جسے دوسری جگہ "مفسر" کر دیا گیا۔ بایں طور یہ کہا جائے گا کہ پہلے حکم یا مضمون کو دوسرے حکم یا مضمون نے منسوخ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "متقدمین" کی اس تعریف کی بناء پر قرآنی آیات میں لغوی لحاظ سے، کثرت کے ساتھ نسخ موجود ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مکی سورتوں میں عموماً اصول اور کلیات بیان کیے گئے ہیں اور مدنی سورتوں میں انہی کی تشریح کر دی گئی ہے۔ لیکن متقدمین کے بعد متاخرین نے نسخ کا ایک خاص مطلب متعین کر لیا کہ قرآن مجید میں بعض آیات ایسی ہیں، جنہیں بعد کی آیات نے منسوخ کر دیا ہے۔ اس لیے اب ان پر عمل جائز نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شاہ ولی اللہ دہلویؒ متاخرین کی اس اصطلاح کے مطابق صرف پانچ آیات میں نسخ تسلیم کرتے ہیں۔ شاہ صاحب کے بقول پہلے علماء قرآن مجید میں پانچ سو آیات منسوخ مانتے رہے لیکن جلال الدین سیوطیؒ (متوفیٰ ۹۱۱ھ) نے اپنی کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں صرف بیس آیات میں نسخ کو تسلیم کیا ہے۔ (۲) شاہ صاحب ان بیس آیات میں سے پندرہ میں اس طرح تطبیق کرتے ہیں کہ ان کا منسوخ ہونا ساقط ہو جاتا ہے۔

میرے نزدیک شاہ صاحب کا یہ علمی کارنامہ مینارہ نور کی حیثیت کا حامل ہے۔ اس لئے میں نے ان کی لاتجمل پانچ آیات کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی سعی کا فیصلہ کیا ہے۔ شاہ صاحب نے جن آیات میں نسخ مانا ہے۔ ان میں سب سے مشکل آیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت۔ (الی الآیۃ) ہے سر دست میں اپنی گفتگو اس آیت تک محدود رکھوں گا اور بقیہ آیات آئندہ کسی اور موقع پر بہت جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔ (ان شاء اللہ) شاہ صاحب نے مذکورہ بالا آیت کو، جس آیت سے منسوخ مانا ہے وہ یہ ہے۔ یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین۔ (الی الآیۃ) اور بیان نسخ میں حدیث لاوصیۃ لوارث کو پیش کیا ہے۔

پیش نظر مضمون کا مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب نے جس آیت کو منسوخ قرار دیا ہے۔ ہمارے نزدیک وہ غیر منسوخ ہے۔ اسے کسی بھی صورت، منسوخ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن اسے سمجھنے کے لیے تھوڑی سی دقت نظر کی ضرورت ہے۔ قبل اس کے کہ ہم اس آیت کے غیر منسوخ ہونے کے دلائل فراہم کریں، اردو زبان کے چند نامور مفسرین کے اقوال و آراء اس ضمن میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد طاہر القادری آیت وصیت کے تحت رقمطراز ہیں:

''وصیت کے احکام

۱۔ وصیت کا واجب ہونا ۲۔ والدین اور رشتہ داروں کے حق میں وصیت کا حکم

۳۔ وصیت کا پرہیزگاروں پر لازم ہونا سورۃ النساء کی آیات میراث نازل ہونے کے بعد وجوب وصیت اور والدین اور دیگر ورثاء کے حق میں حکم وصیت منسوخ ہو گیا۔ مگر غیر ورثاء کے حق میں باقی رہا اور وجوب، اباحت یا استحباب سے بدل گیا۔

البتہ بعض استحقاقی اور ضروری معاملات (جیسے یتیم پوتا وغیرہ) میں حکم وجوب سے لازمی وصیت کے سرکاری قانون کا استنباط و اجراء بھی ہو سکتا ہے۔ آیت نمبر ۱۸۱

میں وصیت بدل ڈالنے والے کے لیئے وعید، اور آیت نمبر ۱۸۲ میں ''صحت وصیت کے عمومی تقاضے'' بیان کیئے گئے ہیں۔ جو کہ یہ ہیں۔

۱۔ وصیت کسی وارث کی طرفداری کے لیئے نہ ہو۔

۲۔ وصیت کسی وارث کی حق تلفی کے لیئے نہ ہو۔

۳۔ وصیت خاندانی یا معاشرتی ناچاقیوں کا باعث نہ ہو۔

۴۔ ایسی صورت میں مصالحت کی ہدایت۔'' (۳)

ڈاکٹر طاہر القادری نے بعض استحقاقی صورتوں میں لازمی وصیت کے قانون کا اجراء تسلیم کیا ہے۔ انکی تفسیر سے اس آیت کے غیر منسوخ ہونے کا حکم نکالا جا سکتا ہے۔

ابوالکلام آزاد کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکم وصیت کو صراحتاً غیر منسوخ مانتے ہیں۔ ان کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

''مرنے سے پہلے پس ماندوں کے لیئے اچھی وصیت کرنے کا حکم اور اس اصولی حقیقت کی تلقین کہ:

۱۔ انسان موت کے بعد جو کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ اگرچہ دوسروں کے قبضے میں جاتا ہے۔ لیکن مرنے سے پہلے اس کے ٹھیک ٹھیک خرچ ہونے اور عزیزوں، قریبوں کو فائدہ پہنچانے کی فکر مرنے والے کی زندگی کے فرائض میں سے ہے اور اس ذمہ داری سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ مرنے والے کی وصیت ایک مقدس امانت ہے۔ جو لوگ اس کے امین ہوں۔ ان کا فرض ہے کہ بے کم و کاست اسکی تعمیل کریں۔

۳۔ اگر وہ لوگ جن پر وصیت چھوڑی گئی ہے۔ خیانت کریں تو اس کے لیئے وہ خود جوابدہ ہوں گے وصیت کرنے والا اور وصیت سے فائدہ اٹھانے والے جوابدہ نہیں ہو سکتے'' (۴)

مفتی احمد یار خان نعیمی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''شروع اسلام میں کچھ روز کے لیئے وصیت فرض تھی۔ پھر میراث کی آیتوں سے اسکی فرضیت منسوخ ہوئی۔ صرف جواز یا استحباب باقی رہا۔ نیز قرآن کریم میں کُتِبَ، فرض ہی کے معنٰی میں بولا جاتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ نیز علیکم اور حقا سے فرضیت ہی معلوم ہوتی ہے"(۵) نیز لکھتے ہیں: "بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ آیت منسوخ نہیں کیونکہ یہاں کتب سے حکم استحبابی اور والدین وغیرہ سے محروم ورثاء مراد ہیں۔ یعنی اگر تمہارے ماں باپ وغیرہ میراث سے محروم ہو جائیں تو بہتر ہے کہ تم انہیں وصیت سے مال دے دو"(۶)

مفتی صاحب نے حکم وصیت کے باب میں اسکی فرضیت کو تو منسوخ مانا ہے۔ تاہم اس کے جواز و استحباب کو تسلیم کیا ہے۔ جبکہ دوسری طرف یہ بھی لکھا ہے کہ "قرآن کریم میں کتب، فرض ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ نیز علیکم اور حقا سے فرضیت ہی معلوم ہوتی ہے" اعتراض اور اسکے جواب کے عنوان سے مفتی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وارثوں کے لیے وصیت جائز ہے۔ پھر یہ حکم حدیث جو کہ خبر واحد ہے، کیونکر منسوخ مانا گیا اور اب کیوں باقی نہ رہا؟ جواب: اسکے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حکم اجماع امت سے منسوخ ہے نہ کہ خبر واحد سے (تفسیر احمدی) دوسرے یہ کہ وہ حدیث اگرچہ واحد ہے لیکن قبول امت کی وجہ سے مثل متواتر کے ہوگئی اور متواتر سے نسخ قرآن جائز ہے (کبیر) تیسرے یہ کہ یہ حکم منسوخ نہیں بلکہ علت نہ رہنے کی وجہ سے اُٹھ گیا۔ جیسے قرآن پاک میں زکوٰۃ کے مصرف آٹھ بیان ہوئے۔ مگر عمرؓ کے زمانے میں مؤلفۃ القلوب (مائل باسلام کفار) علیحدہ ہوگئے اور مصرف کل سات رہ گئے۔ یہ نسخ نہ ہوا۔ بلکہ تبدیلی علت سے تبدیلی حکم ہوئی (تفسیر کبیر)(۷)

یہاں اعتراض کے جواب میں جو تین باتیں لکھی گئی ہیں۔ انکی حقیقت ملاحظہ ہو۔ جواب اول میں اجماع امت کو ناسخ القرآن بتایا گیا ہے۔ جواب دوم میں حدیث کو اولاً خبر واحد لکھا گیا ہے۔ ثانیاً اسی خبر واحد کو قبول امت کی وجہ سے مثل متواتر قرار دیا گیا ہے۔ پھر مثل متواتر کو متواتر قرار دے کر ناسخ قرآن کے درجے پر فائز کر دیا گیا ہے۔ ہمیں تو ان دونوں جوابوں میں قرآن مجید کا صراحتاً استخفاف نظر آتا ہے۔ کوئی ہے جو اسے سمجھے؟ جواب سوم میں یہ حکم غیر منسوخ مانا گیا ہے مگر ساتھ ہی علت کے باعث اسے منسوخ بھی مانا گیا ہے۔ جسے مؤلفۃ القلوب کی مثال سے سمجھایا گیا ہے۔ حالانکہ مؤلفۃ القلوب کا مصرف نص قطعی سے ثابت ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانے میں بعض لوگوں کو اس کا مستحق نہ سمجھ کر،

زکوٰۃ دینے سے منع کیا تھا۔ مگر سمجھا یہ گیا کہ انہوں نے مؤلفۃ القلوب کا مصرف منسوخ کر دیا ہے۔ (سعود بما اللہ من ذلک) (عبدالماجد دریا بادی تفسیر ماجدی، حاشیہ نمبر ۱۱۹ زیر آیت ۹۰ سورۂ توبہ) اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں:

خاکسار راقم کے نزدیک بھی قرآن کی دونوں آیتوں سے کوئی آیت منسوخ نہیں بلکہ آیت میراث اس آیت کی شرح ہے۔ کیونکہ اسی آیت میں خدا نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ مگر چونکہ اس وصیت میں کمی زیادتی کرنا انسانی طبائع سے کچھ بعید نہ تھا۔ اسلیئے خدائے عالم الغیب نے اس وصیت کی آپ ہی شرح کر دی بلکہ اس فعل کو جو اسکی شرح میں مستعمل تھا، خاص اپنی طرف نسبت کیا اور فرمایا یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین "یوصی" کے لفظ کو اس جگہ لانا اور متکلم جو عموماً ایسے مواقع پر بولا جایا کرتا ہے نہ فرمانا اسی طرف اشارہ ہے بلکہ یہ افعال (ایصاء) اسی فعل (وصیت مکتوبہ) کی شرح ہے جو پہلے مجمل تھی، پس اب آیت موصوف کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے ان وارثوں کے حق میں جنکے حصے خدا نے مقرر فرما دیئے ہیں۔ یہ وصیت کرنا تم پر فرض ہے کہ اپنے اپنے حصے موافق شریعت کے ہیں۔ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے مگر ان ورثاء کے علاوہ اور لوگ بھی میت سے دور و نزدیک کا تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ انکی نسبت وصیت کی کوئی شرح نہیں بلکہ وہ میت کے اختیار میں رکھا اور من بعد وصیۃ یوصی بھا اودین میں اسی اختیار کی طرف اشارہ ہے۔ ہاں اسکو بھی ایسا کھلا نہیں چھوڑا کہ سارے مال کی وصیت کسی کے حق میں کر دی جائے بلکہ اسکو غیر مضار سے مقید فرمایا، جسکی شرح حدیث میں ثلث تک آئی ہے کہ تہائی مال کی وصیت کو آنحضرت ﷺ نے جائز رکھا اور غیر مضار کی شرح فرما دی اور وارث کے حق میں لا وصیۃ لوارث کہہ کر یوصیکم اللہ کو کتب علیکم الوصیۃ کی شرح ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ جن کے حق میں خدا نے حصے مقرر کر دیے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکی نسبت تو مقررہ حصص کیلئے وصیت کرنے کی حاجت نہیں بلکہ انکی وہی وصیت ہے،
جسکو خدا نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اور جن لوگوں کے حصص مقرر نہیں کیئے
ان کے حق میں میت کو ثلث مال تک وصیت کرنے کی اجازت حاصل ہے۔(۸)

ثناء اللہ امرتسریؒ نے اس مقام پر جو تفسیر کی ہے وہ اس اعتبار سے بہت عمدہ ہے کہ انہوں نے دونوں آیتوں کو اپنی اپنی جگہ غیر منسوخ مان کر تفسیر کی ہے، اس طرح علم تفسیر میں ایک اچھی تطبیق کا اضافہ ہوا ہے، راقم الحروف کا اس آیت میں مختار و مدعا بھی یہی ہے کہ وہ بھی اسے منسوخ نہیں مانتا اس ایک آیت کے غیر منسوخ ہونے کے اقوال، متقدمین اور متاخرین ہر دو میں موجود ہیں، چنانچہ ابن جریر کے مطابق ایک جماعت نے قائلین نسخ کی مخالفت کی ہے، بیضاوی میں بھی اس کے غیر منسوخ ہونے کا قول درج ہے(۹)

قرآنی تائیدات کے طور پر عرض ہے کہ وارثت کے حکم میں ہر جگہ من بعد وصیۃ کا لفظ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو۔

من بعد وصية يوصى بها او دين..............(النساء۔۱۱)

من بعد وصية يوصين بها او دين..............(النساء۔۱۲)

من بعد وصية يوصون بها او دين..............(النساء۔۱۲)

من بعد وصية يوصى بها او دين..............(النساء۔۱۲)

یعنی وراثت کی تقسیم، وصیت کے نفاذ کے بعد ہو.........بتایا جائے کہ اگر حکم وصیت منسوخ ہے تو وہ کونسی وصیت ہے، جو اتنی تاکیدوں کے ساتھ یہاں مذکور ہے؟......دوسرے یہ کہ سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۱۰۶۔۱۰۷ میں وصیت کے لکھے جانے، نیز اس پر عمل درآمد کرنے اور گواہی لینے کا حکم صاف طور پر موجود ہے۔ واضح رہے کہ سورۂ مائدہ، قرآن مجید کی آخری سورتوں میں سے ایک سورت ہے... تیسرے یہ کہ جب قصاص کو فرض کیا گیا تو فرمایا گیا:

كتب عليكم القصاص فى القتلى ....(الی الآیۃ)(البقرہ۔۱۷۸)

جب روزوں کو فرض کیا گیا تو فرمایا گیا: كتب عليكم الصيام ۔ بقرہ ۱۸۳ اور جب قتال کو فرض کیا گیا تو فرمایا گیا: كتب عليكم القتال .....(الی الآیۃ)(البقرہ۔۲۱۶) پھر کیا وجہ ہے کہ حکم وصیت کو منسوخ مانا جائے، جبکہ وہ حکم بھی کتب کے لفظ کے ساتھ آیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

۲۳۶۳۳

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية ......(الی الآیۃ)(البقرہ۔۱۸۰)

حکم وصیت کی آیت کے معنی بالعموم یوں کیئے گئے ہیں:

"مسلمانو! یہ بات بھی تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے، اسکے مرنے کی گھڑی آگئی اور وہ اپنے بعد مال ومتاع میں سے کچھ چھوڑ کر جانے والا ہے تو چاہیئے کہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیئے اچھی وصیت کر جائے" (ابوالکلام آزاد)

اس معنی کی رو سے ایک صورت یہ بنتی ہے کہ جن والدین اور اقربین کو کسی وجہ سے ورثہ نہ مل سکتا ہو، جیسے مثلاً والدین اور اقربین کافر ہوں، تو انہیں وصیت کے ذریعے مال متروکہ فراہم کیا جائے۔ امام ابن حزم کے بقول "ہر مسلم پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنے غیر وارث قرابتداروں کے لیئے وصیت کرے، جو کہ غلامی یا کفر یا محجوب ہونے کے سبب غیر وارث قرار پاتے ہوں۔ ان لوگوں کے حق میں اپنی مرضی کے مطابق وصیت کر سکتا ہے، جسکی کوئی مقدار مقرر نہیں۔ اگر وصیت نہ کی گئی ہو تب بھی ورثاء یا وصی کے مشورے سے ان اقرباء کو بطور وصیت دیا جانا ضروری ہوگا۔ چنانچہ اگر کسی شخص کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک کافر یا غلام ہوں تو ان کے حق میں وصیت کرنا واجب ہوگا" ...الخ(۱۰)

جیسا کہ مولینا عبیداللہ سندھی فرماتے ہیں

"اگر کوئی ایسی صورت ممکن نہ ہوتی کہ کسی وجہ سے وارث بھی غیر وارث ہو جائے اور والدین بھی اپنی اولاد کی وراثت سے محروم قرار دیئے جاسکتے تو اس آیت کی توجیہ ناممکن تھی، لیکن اس معاملہ میں میرے شخصی حالات ایسے تھے، جنکی بناء پر مجھے خاص طور پر اس امر میں غور کرنے کا موقع ملا۔ میری والدہ غیر مسلمہ تھیں، میرے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں سخت بیمار ہو گیا اور مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ اگر میں مر گیا تو اس بے چاری کو کوئی نہیں پوچھے گا۔ اسوقت جو انکی اتنی تواضع کی جاتی ہے وہ محض میری وجہ سے ہے، میرے مرتے ہی یہ بے چاری اس توجہ سے محروم ہو جائیگی۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ آیت كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت میں وصیت کا کیا مطلب ہے۔ اگر کسی کو اس طرح کے حالات پیش آجائیں تو واقعی اسکے لیئے وصیت لازم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میرے لیئے اس آیت پر عمل کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی ایک صورت نکل آئی۔ اسلیئے میں اسے منسوخ قرار دینے کی اب ضرورت نہیں سمجھتا۔ اسی طرح بقیہ آیات میں بھی یہ صورت اختیار کی جاسکتی ہے کہ ناسخ آیت کو "اولیٰ" کے حکم میں مان کرلیا جائے اور منسوخ کو "غیر اولیٰ" سمجھا جائے یا ایک "عزیمت" پر دال ہو تو دوسری "رخصت" پر (۱۱)

اور اس معنی کی رُو سے دوسری صورت یہ نکتی ہے کہ آیت میں والدین اور اقربین کو مال متروکہ کا وارث ہونے کے ساتھ ساتھ موصیٰ لہٗ بھی تسلیم کیا جائے اور حدیث لاوصیہ لوارث کو آیت کے مقابلہ میں منسوخ قرار دیا جائے۔ اور راقم الحروف کے نزدیک یہی تطبیق سب سے زیادہ صحیح ہے جو قرآن کے الفاظ ظاہری کے عین مطابق بھی ہے۔

جہاں تک حدیث لاوصیہ لوارث کا تعلق ہے۔ رحمت اللہ طارق نے اپنی کتاب تفسیر منسوخ القرآن میں اسکی چونتیس اسانید کا تفصیلی جائزہ لیکر، اس کا ضعف ظاہر کر دیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جہاں تک ہماری استقرا اور جستجو کا تعلق ہے۔ تو ان چونتیس اسانید کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی سند ہوگی، جو اہل فن کی نظر سے اوجھل رہی ہو۔ اور ہماری دیانتدارانہ رائے ہے کہ ان تمام اسانید کی حیثیت صفروں کی سی ہے۔ (۱۲)

آیت کی ترکیب یوں بھی ہوسکتی ہے کہ والدین کو موصیٰ لہٗ کے بجائے وصی تسلیم کیا جائے۔ یعنی حکم وصیت کے اجرا و تنفیذ کے لئے والدین اور اقربین مراد لیئے جائیں نہ کہ مال متروکہ کے مصرف کے طور پر... اور آیت کی ترکیب یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس جگہ للوالدین والاقربین کا تعلق ان ترک خیراً سے مانا جائے، یعنی جو شخص مال کثیر اپنے والدین اور اقرباء کے لئے چھوڑے، وہ وصیت کرے۔ اس ترکیب کی رو سے ماں باپ اور اقرباء کیلئے وصیت کرنا مراد نہیں ہوگا۔ کیونکہ وہ تو آیت کی رو سے ورثا میں شامل ہیں۔ ان کے سوا میں وصیت کو جاری کیا جائے گا۔ اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ مرنے والا مال کثیر کا مالک ہو۔ جیسا کہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

ان ترک خیرا... ای مالاً وقیل مالا کثیراً لما روی عن علی رضی اللہ عنہ ان مولی لہ اراد ان یوصی ولہ سبعمائۃ درھم فمنعہ وقال قال اللہ تعالیٰ ان ترک خیرا والخیر ھو المال الکثیر وعن عائشۃ رضی اللہ عنھا ان رجلا اراد ان یوصی فسألتہ کم مالک فقال ثلاثۃ آلاف فقالت کم عیالک قال اربعۃ قالت انما قال اللہ تعالیٰ

مسئلۂ نسخ اور شاہ ولی اللہ دہلوی　　　　پروفیسر ڈاکٹر محمد شکیل اوج

ان ترک خیرا" فان ھذا لشئ" یسیر فاتر کہ لعیالک ۔(۱۳)

یعنی خیرا سے مراد مال ہے اور مال کثیر بھی مراد لیا گیا ہے۔ جیسا کہ حضرت علیؓ کے متعلق روایت ہے کہ جب ان کے ایک آزاد کردہ غلام نے جس کا ترکہ سات سو درھم تھا، وصیت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ نے اسے روک دیا اور فرمایا کہ یہ مال کثیر نہیں ہے اور حضرت عائشہؓ سے کسی نے پوچھا کہ میرے پاس تین ہزار درھم ہیں۔ اور چار وارث ہیں تو آپ نے فرمایا کہ تھوڑی سی چیز ہے، اپنے عیال کے لیئے چھوڑ دو... یہ خیر یعنی مال کثیر نہیں ہے۔

لفظ "خیراً" کو مال کثیر کی معنی میں لینا جہاں ان روایات کی رو سے صحیح معلوم ہوتا ہے وہیں عربی لغات بھی اسکی تائید کرتی ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

وقولہ تعالیٰ ان ترک خیرا .. مالاً" و قال بعض العلماء لایقال للمال خیرٌ حتی یکون کثیرا ومن مکان طیب (۱۴)

یعنی اس آیت میں خیرا سے مراد مال ہے اور بعض علماء کے نزدیک مال کو خیر اس وقت کہیں گے، جب وہ زیادہ ہو، اور نیک ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔

خلاصہ کے طور پر عرض ہے کہ:

۱۔ آیت وصیت منسوخ نہیں ہے۔ کیونکہ آیت وصیت اور آیت وراثت میں تطبیق کی شکل موجود ہے۔

۲۔ وارث کے حق میں بھی وصیت جائز ہے۔ یہ بات نص سے ثابت ہے۔ جو امر قرآن میں وارد ہو، وہ منسوخ نہیں ہوسکتا قرآن کریم نے کتب ماقبل کو منسوخ کیا ہے۔ اسی لیئے وہ آخر الکتب الی یوم القیامہ ہے۔ قرآنی احکام کو کسی انسانی کتاب سے منسوخ ماننا، اس کتاب کو، کتاب اللہ پر حاکم ماننا ہے۔ جو عقلاً اور نقلاً ہر دو اعتبار سے ناقابل قبول ہے۔

۳۔ ڈاکٹر محمد طاہر القادری نے اس آیت کی تفسیر میں وصیت کے اثباتی پہلو کو مدنظر رکھا ہے۔

۴۔ ابوالکلام آزادؒ نے صراحتاً اس آیت کو غیر منسوخ مان کر تفسیر کی ہے۔

۵۔ ثناء اللہ امرتسریؒ نے ایک نئے رنگ میں دونوں آیتوں (آیت وصیت اور آیت میراث) کو غیر منسوخ مان کر تفسیر کی ہے۔

۶۔ مولینا عبیداللہ سندھی نے بھی اس آیت کو ذاتی اور شخصی حالات کی روشنی میں غیر منسوخ مان کر تفسیر کی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۷۔ حدیث "لا وصیۃ لوارث" کسی بھی طرح قرآنی حکم کو منسوخ نہیں کر سکتی۔

۸۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے آیت وصیت کو آیت میراث سے اور حدیث لا وصیۃ لوارث سے منسوخ قرار دیا تھا مگر ہم نے انہی کے اسوہ و اسلوب کو اختیار کر کے اس نسخ کو تطبیق دیکر ختم کیا ہے۔ یوں اس ضمن میں فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں نئی تحقیق و تطبیق کو پروان چڑھایا ہے۔ اور میں اپنے اس مضمون کو انہی کا فیضان سمجھتا ہوں۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص۳۲، اردو ترجمہ رشید احمد انصاری، قدیر سنز پبلشرز، اردو بازار، لاہور سن اشاعت درج نہیں۔

۲۔ اور ان آیات کو اپنے دس شعروں میں نظم بھی کر دیا ہے۔ الاتقان فی علوم القرآن، (اردو) جلد دوم ص۹۹، میر محمد، کتب خانہ مرکز علم و ادب، آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں

۳۔ تفسیر منہاج القرآن (سورۃ البقرہ) ص۱۳۹، منہاج القرآن پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۰۴ء

۴۔ ترجمان القرآن، جلد اول ص۳۰۲۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، حیدر آباد، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

۵۔ تفسیر نعیمی جلد دوم ص۲۰۷، مکتبہ اسلامیہ، مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات سنہ اشاعت درج نہیں۔

۶۔ ایضاً ص۲۱۰

۷۔ ایضاً ص۲۱۹

۸۔ تفسیر ثنائی جلد اول ص۱۲۳، میر محمد، کتب خانہ آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

۹۔ حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی، الجزء الاول ص۴۸۸، المکتبۃ الاسلامیہ محمد ازدمیر، دیار بکر، ترکیا۔

۱۰۔ المحلی، ابن حزم، مطبوعہ مصر، جلد ۹، ص۳۸۴، (بحوالہ مجموعہ قوانین اسلام، جلد چہارم ص۱۳۶۱۔۱۳۹۲، ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن، ادارہ تحقیقات اسلامی، الجامعۃ الاسلامیہ العالمیہ، اسلام آباد، پاکستان سنہ اشاعت ۱۹۹۵ء

۱۱۔ تدریس القرآن، جلد اول ص۵۵۱۔۵۵۲، ابو مسعود حسن علوی، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، ۳۱۰۔ بلاک ۴، آرمی سروسز پلازہ، دی مال راولپنڈی، کینٹ، پاکستان، طبع پنجم ۱۹۹۸ء

۱۲۔ تفسیر منسوخ القرآن، ص۱۹۹، دوست ایسوسی ایٹس، الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

نوٹ۔ یہ قیمتی بحث ص۱۶۲ تا ص۱۹۹ پر محیط ہے۔

۱۳۔ حاشیہ محی الدین شیخ زادہ علی تفسیر القاضی البیضاوی ص۴۸۸۔

۱۴۔ المفردات فی غریب القرآن ص۱۶۰، نور محمد کارخانہ تجارت، آرام باغ، کراچی سنہ اشاعت درج نہیں۔

اسلام کا مقصد حصول حکومت ہے یا مثالی معاشرہ

مولانا محمد جعفر شاہ پھلواریؒ

اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ قیام حکومت اسلام کا کوئی مقصد نہیں بلکہ یہ محض ایک ناگزیر ذریعہ ہے ایک دوسرے بلند مقصد کا۔ اور وہ بلند مقصد ایک مثالی معاشرے کا قیام ہے۔ بحث کو معاشرے تک ہی محدود رکھا گیا ورنہ معاشرہ خود بھی ایک ذریعہ ہے تکمیل فرد کا۔ فرد اور معاشرہ ایک دوسرے سے کچھ ایسے پیوستہ ہیں کہ ان کو باہم جدا کرنا مشکل ہے۔ جنت بجائے خود معاشرہ کی مثالی زندگی ہے۔ وہاں کوئی نظام حکمرانی اور حاکم و محکوم کا فرق نہ ہوگا۔ مگر معاشرہ ایک خاص انداز کا وہاں بھی ہوگا۔

قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ بطور نصب العین کے کوئی حکومت قائم کرنا نہیں چاہتا بلکہ اسلام کا مقصد ایک ایسا صالح معاشرہ قائم کرنا ہے، جس میں حکومت و سیاست کا دباؤ کم سے کم تر ہوتا چلا جائے۔ یہاں تک کہ حکومت کا وجود معاشرے میں اس طرح تحلیل ہو جائے کہ ہر فرد صرف اپنے اخلاقی تقاضے سے اپنی رضا کارانہ خوشدلی کے ساتھ فرائض معاشرہ کو ادا کرتا رہے اور طاعت الٰہی میں اس کے اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ نہ سیاسی ہو نہ روحانی۔ یعنی نہ ملوکیت ہو نہ پیشوائیت۔

اس حقیقت کو سمجھنے کیلئے کئی سوالات کو پہلے حل کرنا پڑے گا:

۱۔ اس دعوت کا کیا ثبوت ہے کہ قرآن قیام حکومت کو طالب نہیں اور وہ صرف نراج معاشرہ چاہتا ہے؟

۲۔ کیا یہ ممکن ہے کہ کسی دور میں انسان حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے؟

۳۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کا مقصد کوئی حکومت کرنا نہیں تو اس سے کیا حاصل؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں قرآن پاک میں کوئی ایسی آیت نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ اسلام کوئی خاص طرز کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ کسی پیغمبر کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نہیں گزرا کہ "میں ایک عمدہ نظام حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یا مجھے خدا نے اسی مقصد کے لئے بھیجا ہے "کے تیرہ سال کی نبوی زندگی کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے ہے لیکن ایک موقع بھی ایسا نظر نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آتا جہاں حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ہو کہ میرا مقصد کوئی اعلیٰ اور صالح حکومت قائم کرنا ہے۔ حضور کا جو اقتدار کی زندگی میں نیز مدنی زندگی میں بلکہ وفات کے بعد بھی آج تک قائم ہے اس کیلئے حکومت کا لفظ اتنا ہی گھٹیا اور ذلیل ہے جتنا قرآن مجید کے لئے کتاب آئین کا لفظ۔ ذرا آئیے ایک سرسری نظر سے ان دونوں.... پیغمبر ﷺ اور اہل حکومت کے اقتدار کے فرق کا موازنہ کرتے چلیں۔

۱۔ حکومت کا اقتدار بے انتہا تنگ ہوتا ہے۔ اس کا دائرہ اثر ظاہر اور جسم کے خول پر ہوتا ہے اور بھی اسی جگہ جو اس کے علم میں آجائے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک سیاسی دباؤ سے انسان کی زبان چپ رہتی ہے لیکن اس کا دل گالیاں اور بددعائیں دیتا رہتا ہے۔ اس کے دل میں صاحب حکومت کی طرف سے شدید نفرت ہوتی ہے۔ اور دل میں یہ آرزو موجزن ہوتی ہے کہ موقع ملے تو اس کا تختہ الٹ دیا جائے اور شدید قسم کا انتقام لے لیا جائے لیکن پیغمبر کا اقتدار قبضہ اہل ایمان کے جسم پر، روح پر، دل پر دماغ پر، جلوت میں خلوت میں، سوتے، جاگتے حرکت میں، سکون میں، افکار پر گفتار پر، کردار پر غرض ساری زندگی اور زندگی کے تمام گوشوں پر ہوتا ہے۔

۲۔ حکومت سے اگر پولیس اور فوج وغیرہ کو ایک سیکنڈ کے لئے ہٹا یا جائے تو حکومت محض ایک لفظ رہ جاتا ہے جو شرمندۂ معنی نہیں ہوتا لیکن پیغمبری اقتدار ان تمام چیزوں سے بے نیاز اور بالاتر ہوتا ہے۔ یہاں یہ ہوتا ہے کہ مجرم اپنا جرم چھپاتا اور بھاگتا پھرتا ہے اور وہاں کسی سی آئی ڈی اور پولیس کے بغیر مجرم خود آکر سزا و تطہیر پر اصرار کرتا ہے۔

۳۔ وہاں اقتدار کا مظاہرہ دولت و امارات، شان و شوکت وغیرہ سے ہوتا ہے اور یہاں درویشی و فقر، سادگی و قناعت کالافانی اقتدار ہوتا ہے۔ فتح مکہ کے دن ابوسفیان نے دیکھا کہ حضور ﷺ وضو فرماتے ہیں تو لوگ غسالۂ وضو اپنے چہروں پر ملنے کو ٹوٹے پڑتے ہیں، یہ محبوبیت و شوکت دیکھ کر ابوسفیان نے حضرت عباس سے کہا:

یا ابا الفضل لقد اصبح ملک بن اخیک عظیما۔ اے عباس تمہارے برادر زادے کا بادشاہانہ اقتدار تو بڑا زبردست ہے۔

عباس نے جواب دیا:

لیس علیک ولکنها النبوة. (ارے بیوقوف) یہ بادشاہت نہیں۔ نبوت ہے (رواہ الطبرانی عن میمونہ)

جناب عباس نے ایک ایسی بچی حقیقت بتائی ہے جو ہماری تمام گفتگو کا عطر اور ہمارے سارے دعوے کی جان ہے۔ اس کے بعد کسی تشریح کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ واقعہ یہ ہے کہ محض حکومت خواہ کسی قسم کی ہو اس کی سرحدیں بادشاہت سے زیادہ دور نہیں ہوتیں۔ حکومت خواہ کسی تنہا انسان کی ..ملوکیت یا امریت کی.... شکل میں ہو یا عوام کے نمائندوں کی.... جمہوریہ کی.... شکل و صورت رکھتی ہو وہ بہر حال ایک فرد یا چند افراد ہی کی حکومت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایک طبقہ حاکم اور دوسرا محکوم ہوتا ہے۔ لیکن نبوت کا پیغام اس سے سراسر مختلف ہے۔ نبوت ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتی ہے جس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہو نہ حاکم۔ علامہ اقبالؒ نے اس الٰہی نظام معاشرہ کا نقشہ بڑی خوبی سے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

کس دریں جا سائل و محروم نیست   عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست
خدمت آمد مقصد علم و ہنر   کار بار اکس نہ سنجد بہ زر
کس زدینار و درم آگاہ نیست   ایں بتاں را در حرم بار او نیست

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ ہر نظام حکومت میں معاشی نظام یہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ دینے والا اور دوسرا لینے والا، ایک غنی اور دوسرا محتاج ہوتا ہے لیکن الٰہی نظام معاشرہ میں کوئی کسی کا محتاج نہیں ہوتا اور اس معاشی مساوات کے بعد سیاسی حاکیت و محکومیت ہوتی اسی طرح علمی سرمایہ داری کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ اس کا نتیجہ بھی آخر وہی اکتناز سیم و زر ہی ہوتا ہے اس لئے یہاں درہم و دینار محض مبادلہ اجناس کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بت بن کر خدائی نہیں کرتا۔ دنیا کی کوئی حکومت ایسی نہیں جو سیم و زر کی خداوندی پر قائم نہ ہو۔ یہ صرف اسلامی نظام معاشرہ ہے جو سب سے پہلے اسی بت کو پاش پاش کرتا ہے۔ اس کے ٹکڑے اڑانے کے بعد پھر اور کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہ سکتی جو اپنی خداوندی قائم کر کے اولاد آدم کو حاکم و محکوم کے دو طبقوں میں بانٹ سکے۔

۴۔ حکومت اور اسلامی نظام معاشرہ میں ایک بڑا فرق یہ بھی ہے کہ وہاں غالب عنصر ہیبت اور دباؤ کا ہوتا ہے اور یہاں محبت، عقیدت، عظمت، خوش دلانہ طاعت اور رضا کارانہ اتباع کا حسین امتزاج ہوتا ہے جو معاشرے کو ایک سدابہار گلدستہ بنا دیتا ہے۔

۵۔ وہاں قانون و سیاست کی خشکی کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور یہاں ساری بنیاد اخلاقی اقدار پر رکھی جاتی ہے۔

۶۔ وہاں مذہب کو اقتدار کا بہانہ بنالیا جاتا ہے اور یہاں اقتدار صرف تقویت دین کے لئے وقف ہوتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔

۷۔ وہاں اہل حکومت انسانوں کے آقا ہوتے ہیں اور یہاں امیر کی حیثیت بھی ایک خدمت گزار بھائی سے زیادہ نہیں ہوتی (اور یہ امارات بھی خودکوئی مقصود نہیں ہوتی)

۸۔ وہاں انسان کا اقتدار ہوتا ہے اور یہاں انسانی اقدار کا اقتدار ہوتا ہے۔

۹۔ وہاں نری عقل اور سیاست ہے اور یہاں عشق کی پیدا کردہ عقل ہے۔ رومی نے سچ کہا ہے ۔

می شناسد ہر کہ از سر محرم ست　　زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم است

۱۰۔ وہاں خالص قاہری ہے اور یہاں دلبری کی راہ سے آنے والی قاہری ہے۔

غرض اسلامی نظام معاشرہ اور انسانی نظام حکومت میں آسمان و زمین کا فرق ہے حکومت جیسی گھٹیا چیز بھی اسلام کا مقصود نہیں بن سکتی۔ اسی لئے نہ قرآن نے اسے اپنا مقصد بنایا نہ کسی رسول نے۔ کسی پیغمبر نے کوئی عمدہ و اعلیٰ نظام حکومت قائم کرنے کی دعوت نہیں دی۔ پیغمبر صرف اپنی اپنی انفرادی و اجتماعی اصلاح حال کی دعوت دیتا ہے۔ کجا حکومت کی عیاریاں اور کجا اسلامی نظام معاشرہ کی ایمانداریاں۔ شتان بینھما۔ ممکن نہیں کہ کسی فرد یا قوم کا مقصد حکومت ہو اور وہ اس کے لئے ہر ممکن شیطنت و ابلیسیت کو کام میں نہ لائے۔ نظام حکومت کے معنی ہیں انسانوں کو دو طبقوں... حاکم و محکوم... میں منقسم کر دینا اور اس تقسیم کو قائم رکھنے کے لئے اخلاق سے کہیں زیادہ قاہرانہ وجابرانہ دباؤ، سیاسی عیاریوں، ظالمانہ چالبازیوں، ابلیسی سازشوں اور شیطانی فریب کاریوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ اسکے نزدیک عدل و انصاف، انسانیت، اخلاقی اقدار بے معنی الفاظ ہوتے ہیں۔ ان اوصاف حمیدہ کو اگر حکومت باقی رکھتی ہے تو ان اوصاف کی خاطر نہیں بلکہ صرف اس لئے اور اسی حد تک کہ حکومت کا استحکام قائم رہے۔ اسلام اس طبقاتی تقسیم کو اور اس کی خاطر ان انسانیت کش عیاریوں کو کب روا رکھ سکتا ہے جو حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں۔

یہاں ایک زبردست شبہ یہ پیدا ہوگا کہ عملی اسلام کے بہترین دور... عہد نبوت اور عہد خلفائے راشدین... میں بہر حال ایک ''انداز حکومت'' موجود تھا۔ پس جب خیر القرون میں حکومت سے مفر نہ ہو سکا تو بعد کے کسی دور کے متعلق یہ توقع کب کی جاسکتی ہے کہ وہ حکومت کی ضرورت سے بے نیاز ہو سکے گا؟

یہ سوال بلاشبہ دل میں کھٹک پیدا کرسکتا ہے لیکن اس سے ہمارے اصل دعوے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خیر القرون میں کسی بات کا پایا جانا اور چیز ہے اور اس بات کا مقصود ہونا اور شے ہے۔ خیر القرون میں کئی ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو بذات خود مقصود نہیں۔ اس وقت ان باتوں کا پایا جانا یقیناً

© rasailojaraid.com

ناگزیر تھا۔ وہ خیر القرون اس لئے ہے کہ ان حالات میں اس سے بہتر معاشرہ نہ کبھی قائم ہوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود وہاں کئی چیزیں ایسی موجود تھیں جن کا موجود ہونا ناگزیر تھا لیکن وہ مقصود نہ تھیں۔ ان چیزوں کو اس نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہئے کہ وہ چیز موجود تھی، ان کو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے کہ ان کا رخ کس مقصد کی طرف مڑا ہوا تھا۔ آیا وہ چیزیں اس لئے اختیار کی گئی تھیں کہ وہ بذات خود مقصود تھیں یا اس لئے کہ عبوری طور پر انہیں اختیار کرنا ناگزیر تھا اور مقصود کچھ اور تھا؟ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے چند مثالوں پر غور کیجئے جو ہم کئی موقع پر پیش کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ قرآن نے کئی جگہ لونڈی غلام کے متعلق احکام دیئے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد غلامی کی توثیق نہیں بلکہ ایسا نظام معاشرہ تعمیر کرتا ہے جس میں غلامی کی رسم ہی ختم ہو جائے اور تمام انسان یکساں آزادی کی سانس لیں۔

۲۔ قرآن نے محتاجوں اور سائلوں کی اعانت پر بار بار ابھارا ہے لیکن اس کی غرض یہ نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ بھیک مانگنے والوں کا ایک طبقہ ضرور موجود رہے تاکہ ان کی امداد کا ثواب لوٹا جایا کرے۔ بلکہ اس سے غرض ایسا معاشی نظام بنانا ہے جس سے محتاجی دور ہو جائے اور کوئی کسی کا دست نگر نہ رہے۔

نے بہ بازاراں زبیکاراں خروش　　نے صدا ہائے گدایاں در دو گوش

کس نہ باشد در جہاں محتاج کس　　نکتۂ شرع مبین این ست و بس (اقبال)

۳۔ قرآن نے متعدد جرائم کے لئے سزائیں بتائی ہیں لیکن ان کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ دنیا میں ہمیشہ وہ جرم ہوتے رہیں تاکہ سزائیں دے دے کر قرآنی حکم پورا ہوتا رہے بلکہ اسکا اصلی مقصود یہ ہے کہ معاشرے سے جرائم کا خاتمہ ہو جائے اور تعزیر وحدود کا قانون معطل ہو جائے۔

۴۔ قرآن بار بار قتال و جنگ پر ابھارتا ہے لیکن اس کا اصلی مقصد اس کے بالکل برعکس ہے یعنی آخرکار وہ ایسا نظام امن قائم کرنا چاہتا ہے کہ جنگ کا نام ونشان بھی باقی نہ رہے۔

اندراں عالم نہ لشکر نے قشوں　　نے کسے روزی خورد از کشت و خوں

۵۔ قرآن نے طلاق کے متعلق بھی احکام دیئے ہیں لیکن ان سے مقصود طلاقوں کو رواج دینا نہیں بلکہ اسے ختم کرنا ہے۔

۶۔ قرآن نے وراثت کے بھی احکام دیئے ہیں لیکن اس سے مقصد جاگیرداری کی توثیق یا بقا نہیں بلکہ اسے دوسری تیسری پشت میں بتدریج اس طرح ختم کر دینا ہے کہ آخر میں ضرورت بھر رہ جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہوگی کہ قرآن کے بہت سے احکام ایسے ہیں جو اپنے اصلی مقصد کے ہم شکل نہیں بلکہ گویا نقیض ہیں اور علاج بالضد کی طرح ناگزیر علتیں ہیں جو اگرچہ مجبوراً اختیار کرنی پڑتی ہیں لیکن خود مقصود نہیں ہوتیں۔

اس کے بعد یہ بات بھی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ قرآن نے اگرچہ امیر و مامور کے متعلق بھی احکام دیئے ہیں اور خیر القرون میں بھی نظام امارت موجود تھا۔ لیکن منتہائے مقصود کسی سیاسی و قانونی استبداد کا نظام حکومت قائم کرنا نہیں بلکہ وہ اس راہ سے ایک ایسا "لا ریاست" صالح معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ بلکہ ہر شخص اتنی بلندی پر پہنچ جائے کہ کسی روحانی و سیاسی (پیشوائی و حکومتی) واسطے کے بغیر براہ راست طاعت الٰہی کرتا رہے۔ یہ تجربہ ہر روز ہمارے گھروں میں بھی ہوتا رہتا ہے۔ ہم بچوں پر اپنی حکومت ہی قائم کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے کام جن کے فلسفے کو بچہ نہیں سمجھ سکتا اسے ڈانٹ ڈپٹ کر، دھمکیاں دے کر، دباؤ ڈال کر، کرا لیتے ہیں۔ لیکن یہ جبر و اکراہ محض عارضی، وقتی اور عبوری ہوتا ہے، ہمیشہ قائم رہنے کے لئے نہیں۔ اسے اس راہ سے ایک ایسے مقام پر لیجانا مقصود ہوتا ہے۔ جہاں اس میں سمجھ آ جائے اور وہ اپنے فرائض کسی دباؤ کے بغیر ہی ادا کرنے لگے۔ بالکل یہی شکل معاشرے کی ہوتی ہے۔ معاشرے سے جو کام بھی حکومتی دباؤ ڈال کر لیا جاتا ہے وہ ایک عبوری اور ناگزیر ذریعہ ہوتا ہے۔ اس حکومتی دباؤ کو کوئی دائمی مقصد سمجھ لینا صحیح نہیں۔ اس ناگزیر دباؤ کے ذریعے کاروان انسانیت کو ایک ایسی منزل پر لیجانا مقصود ہے جہاں یہ دباؤ ختم ہو جائے۔ بلاشبہ یہ منزل دور ہے۔ بہت دور۔ مگر مقصد اور نصب العین یہی ہونا چاہیے۔

یہیں سے دوسرے سوال کا جواب شروع ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا کبھی انسان پر ایسا دور آنا بھی ممکن ہے کہ وہ حکومت سے بے نیاز ہو جائے؟ بلکہ تیسرے سوال کا جواب بھی اسی میں آ جاتا ہے جو یہ ہے کہ یہ تسلیم کرنے سے کہ اسلام کا مقصد حکومت نہیں کون سا فائدہ ہے؟

بات یہ ہے کہ مثالی معاشرہ ایک نصب العین ہے۔ نصب العین نام ہی ہے اس حقیقت کا جو کبھی حاصل نہ ہو، یا افق کی طرح ہمیشہ نظر کے سامنے آگے آگے رہتا ہے۔ اور اسے ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ فطرت ارتقاء پذیر ہے۔ ساری کائنات میں ارتقا جاری ہے۔ ہر شے ایک نصب العین کی طرف بے ساختہ بڑھتی اور کھنچتی چلی جا رہی ہے اسے کسی مقام پر ٹھہراؤ نہیں۔ اگر نصب العین حاصل ہو جائے تو وہیں ٹھہراؤ پیدا ہو جائے گا۔ اور ارتقاء ختم ہو جائے گا۔ قدرت نے اس کائنات کا

نظام ہی کچھ ایسا بنایا ہے کہ نصب العین تو حاصل نہیں ہوا کرتا مگر نصب العین متعین کئے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ گویا نصب العین یہ رہ جاتا ہے کہ ایک ایسے نصب العین کی طرف بڑھتے چلے جاؤ جو کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ غالب نے اس حقیقت کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے کہ:

گفتمش: ذرہ بخورشید رسد؟ گفت: محال
گفتمش: کوشش من طلبش؟ گفت: رواست

ذرہ خورشید تک پہنچ تو نہیں سکتا لیکن اس کا کام یہی ہے کہ خورشید تک پہنچنے کی کوشش میں اپنی زندگی ختم کر دے۔ رومی نے اسے دوسرے انداز سے یوں ادا کیا ہے۔

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آں کہ یافت می نشود، آنم آرزوست

تم کہتے ہو کہ مقصود حاصل نہیں ہوتا اور میرا مقصود ہی وہ ہے جو حاصل نہ ہو سکے سقراط نے کہا ہے کہ "نقطے کا وجود محض ذہنی ہے۔ خارج میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جا سکتی جس پر نقطے کی تعریف صادق آ سکے یعنی اس میں نہ طول ہو نہ عرض ہو نہ عمق ہو لیکن جب تک نقطے کو تسلیم نہ کیا جائے اس وقت تک خارج میں کوئی اقلیدسی کام چل ہی نہیں سکتا" جس کا طول (بلا عرض و عمق) "خط" ہے اور خط کا صرف متعین کنارہ (بلا طول و عرض و عمق) نقطہ ہے۔ یعنی نقطے کا حصول ممکن ہی نہیں لیکن اسے مانے بغیر نہ خط بنتا ہے نہ سطح، نہ اقلیدسی شکلیں اور نہ جسم یہی صورت نصب العین ہے کہ اسے مقصد بنانا پڑے گا۔ جس کا حصول تو ممکن نہیں۔ لیکن اس کے بغیر کوئی جدوجہد ہی ناممکن ہے۔ سب سے بڑا اور اصل نصب العین خدا ہے۔ اس کا عرفان ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ جیسے بندۂ خدا کو بھی یہی کہنا پڑا کہ:

ما عرفناک حق معرفتک　　　جیسا عرفان چاہیے تھا وہ مجھے بھی حاصل نہ ہو سکا۔

بس جس مثالی معاشرے کا ذکر اوپر ہوا ہے..... جس میں حکومت کا کوئی وجود نہ ہے... وہ بے شک ممکن الحصول نہ ہو لیکن نصب العین وہی رہے گا (آئیڈیل وہی معاشرہ ہے جو پوری طرح حاصل نہ ہو سکے لیکن نگاہ اسی پر جمی رہے اور ارتقاء اسی کی طرف ہوتا رہے۔ اگر ایسا معاشرہ حاصل ہو جائے تو ارتقاء وہیں ختم ہو جائے گا اور جو چیز ارتقاء کو ختم کر دے وہ نصب العین نہیں بن سکتی۔ زندگی کا بڑا مقصد جنت کا حصول ہے لیکن ایسا قرار وہاں بھی نہیں جو ارتقاء کو ختم کر سکے۔ وہاں کی زندگی کے متعلق بھی قرآنی ارشاد یہی ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لهم درجات عند ربهم — درجات کالا انتہائی ارتقاء وہاں بھی ہے۔

پس یہ سوال ہی بے معنی ہے کہ "انسان پر کوئی ایسا دور بھی آ سکتا ہے جب اسے حکومت کی ضرورت نہ رہے؟ ایسا دور آئے یا نہ آئے لیکن نصب العین یہی رہے گا اور اسی بلند مقصد کی طرف معاشرتی نظام کا رخ رکھا جائے گا۔ نصب العین اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ حاصل کیا جائے بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے حصول کی کوشش میں ساری توتیں صرف کی جاتی رہیں۔ نصب العین حاصل تو نہیں ہوتا لیکن اس کا قرب زیادہ سے زیادہ حاصل ہوتا ہے اور اس سے ملتی جلتی نعمت اور اس سے ہم رنگی کی دولت حاصل ہو جاتی ہے جسے ہم تقرب یا تخلق کہہ سکتے ہیں۔ پھر اس تقرب اور تخلق میں بھی لاانتہا درجات ہیں۔ ہر تقرب کے آگے ایک اور تقرب اور تخلق کے بعد ایک اور بلند تر تخلق کا مقام ہے بس اسی طرح ارتقاء کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غرض نصب العین قیام حکومت نہیں بلکہ اختتام حکومت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آج تک ہر زمانے میں کسی نہ کسی شکل میں حکومت کا وجود رہا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اس کے باوجود ہمارا دعویٰ اپنی جگہ قائم ہے شر کا وجود بھی ہمیشہ رہا ہے اور انسان کبھی اس سے بے تعلق نہیں رہ سکا بلکہ اس کا وجود اتنا ضروری ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو خیر کا عرفان بلکہ وجود بھی ناممکن ہے۔ لیکن بہر حال نصب العین خیر ہی رہے گا۔ وجود شر ضروری ہونے کے باوجود کبھی مقصد نہیں بن سکتا۔ دنیا میں کفر بھی ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کے بغیر اسلام کی شناخت ناممکن ہے۔ اس کے باوجود مقصد اسلام ہی ہوگا۔ اسی طرح حکومت کا وجود بھی ایک شر ہے... ناگزیر شر... اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود یہ مقصد نہیں یہ تو صرف ایک ایسا شر ہے جو کسی بڑے شر کو دور کرنے میں مدد دے سکتا ہے۔

یہ بھی ٹھیک ہے کہ اس کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ کام تو روپے کے بغیر بھی نہیں چل سکتا لیکن کون دعوے کر سکتا ہے کہ روپیہ کوئی نصب العین یا مقصد ہے۔ روپے سے زکوٰۃ دی جاتی ہے، حج کیا جاتا ہے، مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، جہاد کیا جاتا ہے۔ کون سی نیکی ہے جو روپے سے نہیں ہوتی ؟! اس کے باوجود روپیہ کوئی مقصد نہیں۔ اور اگر یہی مقصد بن جائے تو اس سے بڑا دنیا میں کوئی شر نہیں۔ قرآن اس کی مذمت سے بھرا پڑا ہے۔

اس کے بعد تیسرے سوال کو لیجئے کہ اگر یہ نظریہ تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام کا مقصد قیام حکومت نہیں تو اس سے فائدہ کیا ہے؟ فائدہ صرف یہ ہے کہ ایک نصب العین سے انسان کا زاویہ نظر ہی

بدل جاتا ہے اور اس سے پوری زندگی اور پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے زندگی اور معاشرے کا سارا نظام زاویۂ نگاہ ہی کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ اگر انسان جنگ کو مقصد بنا لے تو ہر حیلے بہانے سے جنگ چھیڑا کرے گا اور اگر مقصد جنگ کو ختم کر کے ایسا نظام امن قائم کرنا ہو جس میں جنگ کا نام و نشان ہی مٹ جائے تو اس زاویہ نظر کا لازمی اثر یہ ہوگا کہ:

۱۔ انسان جنگ کو جہاں تک ٹال سکتا ہے ٹالے گا۔

۲۔ صرف وہیں جنگ کرے گا جہاں یہ ہر لحاظ سے ناگزیر ہو۔

۳۔ اتنی ہی جنگ کرے گا جتنی ضروری ہو۔

۴۔ حاکم و محکوم کی خلیج برائے نام رہ جائے گی۔

۵۔ مساوات انسانی کا دور دورہ ہوگا۔

۶۔ حکومتی انداز صرف وہیں استعمال ہوگا جہاں کوئی اور چارۂ کار ہی موجود نہ ہو۔

۷۔ حکومت کے اظہار کی ضرورت کم سے کم ہوگی۔

۸۔ ہر حرکت و سکون کا رخ اس طرح ہوگا کہ ایک طرف حکومت کا انداز رفتہ رفتہ ختم کیا جائے اور دوسری جانب اسی تناسب سے اخلاقی اقدار کو ترقی دی جائے تاکہ ایک دن حکومت کا وجود اور اس کی ضرورت ختم ہو جائے اور ساری طاعت الٰہی کسی قانونی و سیاسی دباؤ کے بغیر رضا کارانہ خوش دلی کے اندرونی جذبے سے ہونے لگے۔

ایک بڑا مغالطہ یہ ہوتا ہے کہ آنحضرت اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے ادوار کو ایک نظام حکومت تسلیم کرنے کے بعد گفتگو کی جاتی ہے۔ اس دعوے کی دلیل مشکل ہے کہ حضور ﷺ نے کوئی حکومت قائم فرمائی تھی یا صحابہ کرام نے قیام حکومت کو اسلام کا مقصد سمجھا تھا۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا مقصد ایک اعلیٰ اور صالح نظام معاشرہ تھا۔ حکومت کا تھوڑا سا انداز ایک مجبوری اسے اختیار کیا گیا جو ناگزیر تھا اور چونکہ قیام حکومت مقصد نہ تھا اس لئے ان سب کا رخ اسی طرف تھا کہ حکومت کو تدریجاً ختم کر دیا جائے اور معاشرے کو ایسے مقام پر لا کھڑا کیا جائے جہاں حکومت بے معنی اور بے ضرورت ہو کر رہ جائے۔ انہیں حکومت کا اگر کسی مجبوری سے استعمال ناگزیر نظر آیا تو آٹے میں نمک کے برابر یا اس سے بھی کم استعمال کیا۔ اور وہ بھی صرف اس وجہ سے ہوا کہ اصلاح معاشرہ کا کوئی خاص خلا اس کے بغیر پر نہ ہو سکتا تھا۔ ان کا اصل رجحان اور زاویہ نظر قیام حکومت نہ تھا بلکہ اسے مٹانا تھا اور اگلی سیرتیں اس پر بہترین

© rasailojaraid.com